© rasailojaraid.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نظرات

النبأ العظیم

(۱۱)

اب سوال یہ ہے کہ جب یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں تو پھر آخر پارلیمنٹری سیاست میں مسلمانوں کی شرکت کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ گذارش یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر لکھنؤ میں مسلمانوں کا جو پہلا کنونشن ہوا تھا۔ جن حضرات نے اس میں شرکت کی ہے انھیں غالبًا یاد ہوگا کہ اس موقع پر مولانا نے جمعیۃ علمائے ہند کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کہ اب جمعیۃ کو سیاسیات سے بے دخل ہو کر اپنی جدوجہد صرف مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی معاملات کے لئے وقف رکھنی چاہیے۔ فرمایا تھا کہ اب آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر سیاسی کام کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا "اگر آپ حضرات سیاسی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس مقصد کے لئے ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت بنا سکتے ہیں اور پھر ترکوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: ترک نوجوانوں نے ایک جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے بنائی تھی جس نے ملک کی اصلاح و ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اسی طرح آپ لوگ بھی اس نام سے یا اسی سے ملتے جلتے کسی اور نام سے ایک مشترک پلیٹ فارم بنائیے۔ مولانا صرف اس قدر فرما کر اور ملک کی ایک نہایت اہم ضرورت کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے اور وہ اس خیال کو پھیلا کر بیان نہیں کر سکے اور واقعہ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ مولانا کو کانگرس اور گورنمنٹ میں جو بلند مرتبہ و مقام حاصل تھا اس کے پیش نظر وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔

لیکن مولانا کو قدرت نے سیاسیات میں جو روشن ضمیری اور بیدار مغزی عطا کی تھی جو حضرات اس کا یقین رکھتے تھے اور خود بھی صاحبِ بصیرت تھے انھوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ ملک میں تقسیم کے باعث جو حالات پیدا ہوئے ہیں اور اس سے قطع نظر یوں بھی یہاں کے مختلف صوبوں کے لوگوں کی جو اخلاقی، ذہنی اور فکری سطح ہے اس کے باعث اب آیندہ ملک کو دو قسم کے خطروں کا مقابلہ کرنا ہوگا:

(۱) ایک مذہبی و علاقائی اور لسانی عصبیت اور اختلاف و نزاع۔ اور

(۲) دوسرے ملکی معاملات و مسائل میں رجعت پسندی اور قدامت پرستی۔

ظاہر ہے کسی بھی ملک کی سالمیت اور اس کی آزادی کی حفاظت و بقا کے لئے ان دو چیزوں سے زیادہ خطرناک کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف مستقبل میں ان خطرات کا شدید احساس تھا جس کی وجہ سے مولانا سخت بے چینی اور اضطراب محسوس کرتے تھے اور دوسری جانب وہ ملک کی مختلف جماعتوں اور پارٹیوں پر اس دردِ نہاں کے درمان کی تلاش و جستجو میں نگاہ دوڑاتے تھے تو انھیں مایوسی ہوتی تھی۔ بے شبہ کانگرس ملک کی سب سے زیادہ باوقار موثر اور فعال جماعت تھی اور اس کی اس وقت تک کی پوری تاریخ ایک عظیم مقصد کے لئے غیر معمولی ایثار و قربانی اور صبر و تحمل کی تاریخ تھی۔ لیکن مولانا تحت الشعور میں اس کا یقین رکھتے تھے کہ مرکز اور صوبوں میں حکومت کی کرسی سنبھال لینے کے بعد کانگرس ایثار و قربانی اور بے لوث خدمت کی اس اعلیٰ سطح پر قائم نہیں رہ سکے گی جس پر کہ وہ اب تک تھی۔ اعلیٰ اقتدار اور ناقابل شکست طاقت یہ دونوں چیزیں بڑے سے بڑے مخلص اور بے غرض انسان کے لئے ایک عظیم ابتلا اور آزمائش ہیں اور ایسے خوش نصیب کم ہی ہوتے ہیں جو اس آزمائش سے کامیاب گذر جائیں۔ مولانا پر سخت قنوطیت طاری تھی اور وہ غالباً یہ سمجھتے تھے کہ انھیں اس کارزارِ حیات میں جو کچھ کرنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا وہ سب کر چکے ہیں۔ ورنہ حق یہ ہے کہ مسلمانوں کو خصوصاً اور ملک و قوم کو عموماً میدان میں کام کرنے کے لئے ابوالکلام آزاد کی جو ضرورت اب تھی وہ آزادی سے پہلے نہیں تھی۔ اور یہی بات پنڈت جواہر لال نہرو کی نسبت کہی جا سکتی ہے۔ لیکن "مولانا" الہلال اور البلاغ کی ادارت کے زمانہ میں جس زبان میں بولنے کے عادی تھے۔ اگر اس کی رعایت کی جائے تو مولانا کی طرف سے معذرت میں کہا جا سکتا ہے کہ آزادی سے قبل جب جسم میں طاقت تھی اور قلب میں جذبۂ عمل و ایذا طلبی بیدار تھا مولانا عزیمت پر عمل کرتے تھے۔ لیکن اب جب کہ حصول آزادی کی جنگ جیت لینے کے بعد وہ تھک کر چور ہو گئے تھے ان کے لیے رخصت پر عمل کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ "جہانگیری" سے زیادہ اہم مگر مشکل تر "کار جہانداری" ہے تو آزادی کے بعد ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ جتنی بھی جماعتیں اور پارٹیاں تھیں وہ اور ان کے لیڈر حکومت کی کرسیاں سنبھالنے اور اگر حکومت نہ ملی تو اس کے لئے سیاسی جوڑ توڑ کرنے پر پل پڑیں۔ اور قوم کی سیرت سازی یا سوشل ورک کا میدان یکسر خالی رہ گیا۔ اس سیاست بازی نے جب خواص کا مزاج ہی فاسد کر دیا تو پھر عوام کس شمار قطار میں تھے۔ "جیسے راجہ ویسی پرجا" ایک قانون فطرت ہے جس سے کوئی قوم مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر روشن کے سامنے ملک کے مستقبل کا یہ ایک نقشہ تھا جس کی بین السطوری جھلکیاں کہیں کہیں ان کی کتاب INDIA WINS FREEDOM میں نظر آتی ہیں اور جس کو اشاروں کنایوں میں وہ اپنی نجی صحبتوں اور مجلسوں میں بیان کر کے اس پر سخت تشویش و اضطراب کا اظہار فرماتے تھے۔ اس بنا پر مولانا کی دلی خواہش تھی کہ ایک نئی آل انڈیا نیشنل پارٹی ہونی چاہیے جو نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ عزم و ہمت اور خلوص و بے لوثی سے ملک میں اتحاد اور اس کی ترقی کے لئے کام کرے۔ مولانا کی آرزو تھی کہ مسلمان اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اس کا ایک عظیم فائدہ جہاں یہ ہوگا کہ ملک کو مذکورۂ بالا دو خطرے جو درپیش ہیں ان کے تدارک کا سروسامان ہوگا۔ ساتھ ہی یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں ہوگا کہ خود مسلمانوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعلق ملک میں جو غبار آلود فضا قائم ہوگئی ہے وہ چھٹنی شروع ہو جائے گی۔

جن لوگوں کو مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنے اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ اخیر زمانہ میں مولانا پر کبھی کبھی عالم جذب طاری ہو جاتا تھا اور اس عالم میں بعض اوقات ایسی باتیں آپ کی زبان سے بیساختہ نکل جاتی تھیں جو لب ولہجہ کے اعتبار سے اگرچہ تلخ ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے گنجینۂ معنی وحقائق ہونے میں کلام نہیں تھا۔ اسی قسم کے لمحات میں ایک مرتبہ نہیں متعدد بار راقم الحروف کی موجودگی میں مولانا نے اپنی مجلس میں جمعیت علمائے ہند کے بعض اکابر کا نام لے کر فرمایا: "میں اپنے ان ساتھیوں اور دوستوں کا یہ قصور کبھی معاف نہیں کروں گا کہ انھوں نے میرے استاد حضرت شیخ الہند کا منشا پورا نہیں کیا۔ در اصل حضرت شیخ کا منشا یہ تھا کہ ملک میں تحریک آزادی شروع ہو اور اس کی قیادت کا جھنڈا ہمارے ہاتھ میں ہو۔ لیکن اب میں تیس برس کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان آیا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ معاملہ بالکل برعکس ہو گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ قیادت اور رہنمائی کانگرس کے ہاتھ میں ہے اور جمعیۃ العلماء اس کی انگلی پکڑ کر ساتھ ساتھ چل رہی ہے"۔ یہ فرمانے کے بعد غصہ کے مارے مولانا کا چہرہ تمتما اٹھتا اور لب ولہجہ اور تند وتیز ہو جاتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذہن بھی در اصل حضرت شیخ الہند کے مدرسۂ فکر کا تربیت یافتہ تھا اس بنا پر ہمارا خیال ہے کہ مولانا شعوری یا نیم شعوری طور پر یہ سمجھتے تھے کہ (حضرت شیخ الہند کے مذکورۂ بالا نقطۂ نظر کے مطابق) جو کام آزادی کی جدوجہد کے زمانہ میں نہیں ہوسکا حصولِ آزادی کے بعد پھر ایک اور موقع آیا ہے تو اب ہونا چاہئے، لیکن ظاہر ہے مولانا کے اس تخیل کو ہم ایک اعلیٰ درجہ کی فلسفیانہ خیال آرائی ہی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا حال یہ تھا کہ

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

ملک کے افق پر آزادی کا سورج کیا طلوع ہوا کہ مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرش سے تا عرش، واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا

یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

جب جینے کے ہی لالے پڑے ہوں تو پھر اس طرح کی تنظیم، تحریک اور پارٹی سازی جیسی چیزوں کے متعلق سوچنے اور ان پر غور کرنے کا کیا موقع ہو سکتا تھا۔ اور خود مولانا پر بھی حالات کی شدت کے باعث قنوطیت کا اس درجہ غلبہ تھا کہ بس وہ صرف ایک اشارہ دے کر بیٹھ رہے اور اس سے آگے کچھ اور نہ کر سکے۔

اچھا! یہ تو پرانی بات ہے جس کا وقت گذر گیا۔ سوال یہ ہے کہ اب جبکہ مسلمانوں کے لئے الگ کوئی سیاسی مشترک پارٹی بنانے کے قوی امکانات نہیں ہیں۔ پارلیمنٹری سیاست میں مسلمانوں کا موقف کیا ہونا چاہیئے؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ہم اس سوال کے جواب میں خود کسی ایک خاص سیاسی پارٹی کا نام لیکر مسلمانوں کی رائے عامہ کو متاثر کرنا نہیں چاہتے۔ یہ مسئلہ ہر شخص کی اپنی صوابدید اور رجحانِ طبع کا ہے اور اسے حق ہے کہ وہ آزادیِ ضمیر اور آزادیِ رائے کے حق کا استعمال جس طرح چاہے کرے۔ البتہ ہم نے یہ پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ملک میں بنیادی طور پر صرف دو ہی گروہ ہیں۔ ایک رجعت پسند جو ذات پات، رنگ و نسل، مذہب و زبان اور دولت و سرمایہ، ان میں سے ہر چیز کے متعلق سرمایہ دارانہ (Capitalistic) اور تفرقہ پسند (sectarian minded) ذہن رکھتا ہے اور ملک کے تمام معاملات و مسائل کو اپنے اسی خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور دوسرا گروہ ترقی پسندوں کا ہے جس نے وقت کی آواز کو سن لیا اور زمانہ کے رُخ کو پہچان لیا ہے اور اس بنا پر عوامی جمہوریت، مساوات، حقوقِ انسانی، دولت و سرمایہ کی مساوی تقسیم اور عدم طبقاتیت پر اس کا یقین ہے۔ اور اپنے اس یقین اور نصب العین کے ماتحت وہ ریاست کو صحیح معنی میں ایک فلاحی ریاست بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ ان دونوں گروہوں میں جنگ ایک عرصۂ دراز سے برپا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اب اس جنگ کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں موجودہ حالات اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات کا سگنل ہیں کہ ایک نہایت شدید اور عظیم انقلاب ہمارے ملک کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔ یہ انقلاب ناگزیر ہے اور کوئی طاقت اب اس پر بند نہیں باندھ سکتی۔ مسلمانوں کو وقت کی پکار اور زمانہ کے اس رخ کو سمجھنا چاہیئے۔ ملک کا مستقبل انھیں لوگوں اور جماعتوں کے ہاتھ میں ہوگا جو اس انقلاب کے ہراول دستوں میں شریک اور اس کے علمبردار ہوں گے۔

سَتُبدِی لکَ الایامُ ما کنتَ جاھلاً

ویاتیکَ بالاخبارِ مالم تزوّدِ

معاشیات

جس طرح کسی ملک اور حکومت کے قومی سرمایہ (National Incom or Capital) کی بنیاد تجارت، صنعت وحرفت اور فلاحت وزراعت پر ہے اسی طرح اشخاص وافراد اور جماعتوں اور گروہوں کی خوش حالی کا دار ومدار بھی انھیں چیزوں پر ہے۔ تجارت صرف خوش حالی اور رفاہیت کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ (خاص کر مسلمانوں اور عیسائیوں کی) گواہ ہے کہ اس تجارت کی راہ سے ہی قوموں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی ہے۔ اپنی تہذیب، کلچر اور زبان کا پرچار کیا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ بسا اوقات کسی ملک کو فتح کرنا ہوا ہے تو تجارت کے کاروانوں نے فوجی عساکر کے لئے مقدمۃ الجیش کا کام دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر تجارت کا ذکر ہے اور تجارت سے جو معاش حاصل ہوتا ہے اسے کہیں "فضل اللہ" فرمایا گیا ہے۔ کہیں خیر اور کہیں "رزق اللہ"۔ علاوہ ازیں کثرت سے احادیث ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کو بہترین ذریعۂ معاش بتایا ہے۔ ایک روایت میں ارشاد ہوا:

"اے قریش دیکھو! موالی تم پر تجارت میں غالب نہ آجائیں۔ کیونکہ رزق کے بیس ۲۰ دروازے ہیں۔ ان میں سے انیس ۱۹ دروازے تجارت پیشہ لوگوں کے لئے ہیں اور ایک صنعت پیشہ لوگوں کے لئے۔ اور ایک ایماندار تاجر کبھی تنگدست نہیں ہوتا"۔ ایک اور حدیث میں جو مشہور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایماندار تاجر کو پیغمبروں، صدیقین اور شہدا کے ساتھ قرار دیا ہے۔ ایک جگہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمایا گیا: ایماندار تاجر قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا۔ ایک مرتبہ ارشاد ہوا: ایماندار تاجر جنت کے دروازوں سے نہ روکا جائے گا۔ ایک اور موقع پر یہاں تک فرمادیا گیا کہ سب سے پہلے جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ ایماندار تاجر ہے۔

اسلام کی یہی تعلیمات تھیں جن کے اثر سے مسلمانوں نے عرب سے نکل کر جنوب مشرقی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور سنٹرل ایشیا میں ساحلی مقامات پر عالیشان تجارتی کوٹھیاں قائم کیں اور نہ صرف اس قدر بلکہ وینس (Venice)[1] جو مشرق و مغرب کے درمیان نقطۂ اتصال تھا اس کو مرکز تجارت بنا کر انھوں نے یورپ میں عمل دخل شروع کیا اور اسپین، اٹلی، جرمنی اور فرانس بلکہ انگلینڈ تک کے بازاروں کو اپنے ہر قسم کے سامان تجارت سے بھر دیا۔ تجارت اور صنعت و حرفت دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس بنا پر جب مسلمانوں نے تجارت میں ترقی کی تو صنعت و حرفت میں بھی کارہائے نمایاں انجام دئے۔ چنانچہ جس طرح آج امریکہ اور یورپ کی مصنوعات مشرقی ممالک کا قابل فخر سرمایۂ استعمال ہیں۔ قرون وسطیٰ میں عرب مسلمانوں کے مصنوعات و ایجادات کو یورپ کے گھرانوں میں بڑے فخر سے استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مشہور جرمن مستشرق خاتون ڈاکٹر سیگریڈ ہانکا لکھتی ہیں:

"یورپ کی دوشیزائیں عرب مسلمانوں کے بنائے ہوئے نہایت عمدہ اور اعلیٰ قسم کے کپڑوں کا لباس پہنتی اور فخر کرتی تھیں۔"

(فضل العرب علی اوربا ص ۲۳)

---

[1] شمالی اٹلی کی ایک بندرگاہ جسے عربی میں بندقیہ کہتے ہیں

© rasailojaraid.com